

E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A. Urdu

Paper : 05 – Adabi Tanqeed

Module Name/Title : Urdu Mein Tanqeed Ki Riwayat



DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE, MANUU / Prof. Suleman Athar Javeed, Prof. Ashraf Rafi
PRESENTATION	Prof. Suleman Athar Javeed, Prof. Ashraf Rafi
PRODUCER	Md. Mujahid Ali



Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

اکائی 4: اُردو میں تنقید کی روایت

(مشرقی پس منظر کے ساتھ)

ساخت

4.1 تمہید

اس اکائی میں ہم آپ کو اُردو میں تنقید کی روایت کے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے۔ اُردو میں تنقید آج بھرپور اور توانا حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ مغربی تنقیدی اثرات کے باعث اس کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہوں اُردو کے ابتدائی دور میں بھی ہمارے ہاں تنقید کی روایت ملتی ہے۔ اس کی ہیئت اور حیثیت اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھی اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ ہم اُردو تنقید کے ابتدائی منظرنامہ پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ مشرقی ادبی

اور تنقیدی روایات کا اثر غالب تھا۔ ہماری زندگی پر بھی اور ادب پر بھی۔ مشرقی تہذیبی اقدار شعر و ادب پر بھی اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ اس اکائی میں مشاعروں کی ''واہ واہ'' تذکروں' تقریظوں اور اساتذہ کی اصلاحوں وغیرہ میں تنقید کے ابتدائی نمونوں کی نشاندہی کی جائے گی اور مشرقی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناقدین کے فن کو بھی پیش کیا جائے گا۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ امتحانی سوالات بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی بھی ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔

4.2 ادبی تنقید' تعریف اور ماہیئت

تنقید کسی چیز کو جانچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کہتے ہیں۔ ادبی تنقید سے مراد کسی ادبی تحریر یا فن پارے کے بارے میں چھان بین کرنا یا ادبی تجزیہ کرنا ہے۔ چونکہ ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے اور ادب بھی زندگی کی طرح جامد نہیں ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف علاقوں' زبانوں اور زمانوں میں ادبی تنقید کی تعریف میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہ آئی ہو لیکن کہیں کہیں کوئی تبدیلی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تنقید وہ تحریر ہے جو ادب کو پرکھنے اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو جانچنے کے تعلق سے لکھی جاتی ہے۔ یہ بات غلط نہیں لیکن پورے طور پر درست بھی نہیں ہے اس لیے کہ تنقید صرف ادب کی جانچ پرکھ اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی نشاندہی کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ادب کی ترجمانی بھی ہے تفسیر بھی' تشریح بھی اور تجزیہ بھی۔ تنقید اس سے آگے بھی ہے وہ ادب کی رہنمائی بھی کرتی ہے' ادب کو ایک سمت بھی دیتی ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ ادبی تنقید' علم اور کامل بصیرت کے ساتھ مناسب پیرایہ میں کسی فن پارہ کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنے اور اس کے بارے میں حکم لگانے کا نام ہے۔ اور آئی۔ اے رچرڈ کے اس خیال کو بھی دہرایا جاتا ہے کہ تنقید کسی مصنف کی تخلیق کے مدلل محاکمہ اور اس فن پارہ کی جمالیاتی قدروں کو اجاگر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے کہ ''تنقید میں نہ صرف تقریظی پہلو ہوتا ہے بلکہ تخلیقی بھی۔ اس کا کام نہ صرف برائی کی مذمت کرنا ہے بلکہ اچھائیوں کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کر کے ان میں ترقی دینا ہے''...... گویا تنقید میں ایک جامع اور متوازن نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قاری ہی کی نہیں' مصنف کی بھی رہنمائی ہو سکے۔

تنقید کا کام صرف خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کرنا اور اس سلسلے میں فن پارہ سے چند اقتباسات پیش کر دینا نہیں؛...... یہ تو ایک سطحی اور فروعی بات ہوئی بلکہ تنقید تو وہ کام کرتی ہے جو ایک مورخ' ماہر نفسیات' ایک مصلح اور انسان دوست کا کام ہوتا ہے۔ تنقید ادب کو پرکھنے اور اس کی افہام و تفہیم کے تعلق سے ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تنقید کا کام دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہے اور یہ بتانا کہ اس میں دودھ کتنا ہے اور پانی کتنا۔ گویا تنقید کا کام قدر متعین کرنا ہوا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''تنقید قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ جھوٹ اور سچ پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے''۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ تنقید' ادب کے صرف دونوں رخ دکھا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ دونوں رخوں کو آئینہ دکھانے کے بعد یہ فیصلہ دینا بھی ہے کہ کونسا رخ ادب اور زندگی کی ترقی اور صلاح و فلاح کے لیے سودمند اور کارآمد ہوتا ہے۔ اگر تنقید یہ کام نہیں کر سکتی تو وہ کچھ اور بھی نہیں کر سکتی۔ ہمارے ہاں بہت سے قلم کار ایسے ہیں جو تاثرات کو تنقید کا [illegible] دیتے ہیں۔ تاثراتی تنقید ایک دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنقید میں تاثرات ہوتے ہیں اور کوئی تنقید ایسی نہیں جو ناقد کے ذاتی تاثرات سے عاری ہو۔ صرف تاثرات کو تنقید قرار دینا کئی ایک کے نزدیک محلِ نظر ہے۔ تنقید کو چاہئے کہ وہ معروضیت سے کام لیتے ہوئے فن پارہ کا جائزہ لے' معاشرتی اور سماجی حالات کو ملحوظ رکھے اور غیر جانبداری کے ساتھ ادب پارہ پر اظہار خیال کرے۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو میں خاص طور پر ابتدا میں تاثرات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ادبی تنقید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. تنقید کے متعلق آل احمد سرور کے کیا خیالات ہیں؟

4.3 مشرقی پس منظر

تاثرات مشرقی شعریات اور مشرقی زاویۂ تنقید میں جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر زبان کا شعر وادب اور تنقید اپنے آس پاس کے سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات ہی سے متاثر نہیں ہوتے اپنے سے پہلے ادوار کی اقدار بھی شعر وادب میں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ اُردو کے ساتھ جب ہم مشرقی شعریات، مشرقی تنقید یا شعر وادب کے پس منظر کی بات کرتے ہیں تو ہماری دوڑ عربی اور فارسی تک ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی فارسی تک زیادہ اور عربی تک کم۔ یہ درست کہ اُردو زبان اور شعر وادب پر کسی بھی زبان کے مقابلہ میں فارسی شعر وادب کے اثرات، ایک مدت تک زیادہ رہے بلکہ آج بھی وہ گہرے ہیں لیکن اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اُردو پر راست کم سہی، شمالی ہند کی زبانوں پراکرت، اپ بھرنش، پالی، اودھی، برج بھاشا اور بھوج پوری کی وساطت سے سنسکرت اور سنسکرت شعریات کا اثر بھی خاصا رہا۔ گویا اُردو پر سامی اور ایرانی زبانوں ہی کا اثر نہیں رہا ہندوستان کی کلاسیکی اور جدید زبانوں کا بھی اثر رہا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس کو ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ خاص طور پر دکنی شعر وادب اور ادھر شمالی ہند میں بارہ ماسہ وغیرہ جو تحریر کیے گئے اُن پر سنسکرت شعریات کی پرچھائیں کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہیں۔ اور تو اور اقبال کے یہاں بھرتری ہری کا حوالہ اس امر کا غماز ہے کہ اقبال بھی کسی نہ کسی صورت میں مشرقی شعریات سے متاثر تھے۔ بعد ازاں مختلف وجوہ سے اُردو پر سنسکرت شعریات کے اثرات کم ہوتے گئے لیکن غیر ارادی طور پر بلاواسطہ نہیں لیکن بالواسطہ سنسکرت کے اثرات، کم کم سہی، آج بھی موجود ہیں۔ عربی شعریات سے اُردو ایسی متاثر نہیں ہوئی۔ راست تو متاثر ہونے کا سوال ہی نہیں ہاں فارسی کے توسط سے جو بھی اثرات آئے ہوں وہ اپنی جگہ۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی شعریات یا مشرقی تنقید وہ ہے جو اُردو پر سنسکرت، عربی اور فارسی کے اثرات سے برگ وبار لائی۔ بدلتے ہوئے سیاسی اور معاشرتی حالات اور سنسکرت زبان وادب کے سکڑتے دائرے کے سبب سنسکرت کے اثرات اور کم ہوتے گئے۔ اسی طرح عربی زبان سے تہذیبی واسطہ نہ ہونے کی وجہ سے عربی شعریات کے موثرات بھی ایسے نہیں رہے۔ عمومی طور پر مشرقی تنقید سے مراد وہ تنقید ہے جو شاعری کی ہیئت، الفاظ کی چکا چوند اور شاعری کے فنی محاسن سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی نظر شاعری کی ظاہری ہیئت پر ہوتی ہے۔ فن شاعری کے اجزا موضوع گفتگو ہوتے ہیں اور شاعری کی تاثیر پر غور کیا جاتا ہے۔ سادہ اور بول چال کی زبان کی مشرقی تنقید میں اہمیت ہے۔ سہل ممتنع مشرقی تنقید کی اصطلاح ہے۔ مشرقی تنقید میں آرائشِ زبان اور فصاحت وبلاغت کو پیمانہ بنایا جاتا ہے۔ مشرقی تنقید میں تاثر اور تاثیر کی اہمیت ہوتی ہے۔ نقاد سائینٹفک یا معروضی طور پر فن پارہ کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ اپنے ذوق سے کام لیتا ہے۔ مشرقی تنقید میں کسی نقطہ نظر یا تنقیدی دبستان کے تحت تجزیہ کا بھی سوال نہیں وہ اگر قاری رنقاد کو پسند آجائے تو کافی ہے۔ اس میں کسی موضوع کو خواہ کسی طرح ادا کیا گیا ہو اس سے بحث نہیں کی جاتی۔ مشرقی تنقید میں جذبہ واحساس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور الفاظ کی قدر وقیمت کی۔ چنانچہ الفاظ کی نشست وبرخاست اور ان کے محلِ استعمال پر مشرقی تنقید زور دیتی ہے اور اسی خصوص میں اساتذہ کے اشعار بطور مثال اور ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔ روزمرہ، محاورہ، تشبیہہ، استعارے، اشارے، کنایے اور تلمیح وغیرہ کی روشنی میں مشرقی تنقید میں فن پارہ کا جائزہ لیا جاتا ہے گویا مشرقی تنقید میں مواد سے زیادہ فن اور طرزِ ادا کی اہمیت ہے۔ مشرقی تنقید سے فن پارہ کی صحیح قدر وقیمت کا تعین نہ کیا جاتا ہو لیکن اس سے زبان اور اسلوب کے معیارات کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم بیان کے نکتوں، صنائع بدائع کی تفصیلات، علم عروض کی جزئیات، تشبیہات واستعارات، رمز وکنایہ، مجازِ مرسل اور ایسے ہی عناصر کی مشرقی تنقید میں اہمیت ہے اور اس سے روگردانی فن پارہ کی مرتبت کو ختم کردیتی ہے۔ فی زمانہ قاری اساس تنقید اور ہیئتی تنقید کا جو چرچا ہے مشرقی تنقید میں اس کی جھلکیاں یہاں وہاں مل جاتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ آج ہمارے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تہذیبی معاملات کچھ اس نوعیت کے ہو چکے ہیں اور ایسے الجھتے جارہے ہیں کہ ان کی روشنی میں نئے نئے تنقیدی نظریات سامنے آرہے ہیں جب کہ ابتدا میں زندگی سادہ تھی، ایسی الجھنیں نہیں تھیں۔ شعر وادب کا کوئی معاشرتی کردار نہیں تھا۔ لوگ صرف تسکین ذوق، تفریح اور وقت گزاری کے لیے شاعری کرتے تھے۔ ادب کا کوئی افادہ کوئی سماجی مقصد نہیں تھا اس لیے ایسے میں مشرقی اندازِ فکر ہی کافی تھا، لوگ اسی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ آج کے تقاضے اور مسائل بدل گئے ہیں۔ چنانچہ نئے تنقیدی رجحانات، میلانات، افکار اور نظریات کے باوصف مشرقی تنقید زبان وبیان، فن، طرزِ ادا اور اسلوب کے تعلق سے اہمیت رکھتی ہے اس کا ایک حد تک افادہ آج بھی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- مشرقی تنقید سے کیا مراد ہے؟

2- اُردو زبان اور شعر و ادب پر کس زبان کے اثرات زیادہ رہے؟

3- مشرقی تنقید میں کس کی اہمیت ہے؟

4- اُردو پر سنسکرت کے اثرات کیوں کم ہوگئے؟

4.4 اُردو میں تنقید کی روایت

اُردو میں تنقید کی روایت آج کے معنوں میں تو نہیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں ابتدا سے رہی ہے۔ ہماری ایک غلط فہمی یہ رہی ہے کہ اُردو کے قدیم اور کلاسیکی شعرا کے یہاں ہجر و وصال ۔گل و بلبل اور لب و رخسار کی باتیں ہی ملتی ہیں ۔انہوں نے زندگی کے معاملات سے سروکار نہیں رکھا۔ایسا نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ آج کے مسائل اور نظر و نظریات کی جو اہمیت ہے مشرقی ادب اور تنقید کے آغاز میں یہ چلت پھرت نہیں تھی۔ ہمارے ہاں ابتدا میں اس طرح کے نقاد نہ ملتے ہوں جیسے آج ہیں اور اس طرح کے دبستانوں کا وجود نہ ہو جیسے آج ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دور کے شعرا بلکہ نثر نگاروں کے ہاں بھی تنقیدی شعور تھا' پرکھ اور پہچان کے ان کے اپنے زاویے تھے۔ وہ بھی فن پارے کے خوب و خراب پر نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے اشعار' مشاعروں' تذکروں' اساتذہ کی اصلاحوں اور خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے دور کے سماجی اور ادبی پس منظر میں ان کا تنقیدی شعور بھی بالیدہ تھا۔ ان کے اپنے جانچ پڑتال کے پیمانے تھے جن پر اس اکائی میں آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔

4.4.1 شاعری

قدیم اُردو (دکنی) میں یوں تو اور شاعروں کے پاس بھی اشارے مل جاتے ہیں لیکن مُلّا وجہی وہ شاعر ہے جس نے اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' میں شاعری کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ شاعری کے لیے تخلیقی کرب پر زور دینے کے ساتھ ساتھ شعر کو شعوری کوشش بھی قرار دیتا ہے۔ وہ شاعری میں سادگی' نزاکت' معنی آفرینی' جدّت' الفاظ کے موزوں استعمال اور الفاظ و معنی کے درمیان جسم و روح کے تعلق کو مدِ نظر رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ الفاظ ایسے استعمال کیے جائیں کہ قاری بلند معانی سے ہمکنار ہو۔ ''قطب مشتری'' کے ان اشعار سے اندازہ ہوگا۔

جو بے ربط بولے توں بتیاں پچیس ۔۔۔ بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلامت نہیں جس کیرے بات میں ۔۔۔ پڑیا جاے کیوں جز لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نیں ۔۔۔ اسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کرتوں کئی بولنے کا ہوس ۔۔۔ اگر خوب بولے تو یک بیت بس
دو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے ۔۔۔ کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اگر فام ہے شعر کا تج کوں چھند ۔۔۔ چُنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زورا ہے ۔۔۔ ولے بھی مزابات کا ہور ہے

دکنی کا ایک اور شاعر ہے ابنِ نشاطی ...... سنئے وہ کیا کہتا ہے۔

وہی سمجھے' سمجھ ہے جن کو کچ بات ۔۔۔ جو بندھیا ہے سویوں صفت سوا بیات
اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی ۔۔۔ ولے کیا کام آوے بات خالی

مری ہے نظم میں انشا کے دھاتاں　　رہے انشا کے دھاتاں ہورباتاں

اور میر ہیں جنہوں نے کبھی یہ کہا کہ خوش سلیقگی سے جگر خوں کرنا شاعری ہے (مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں رکسی خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں) کبھی یہ کہا کہ درد وغم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا۔ اور کبھی صناعی اور بات بنانے پر زور دیا۔ ان کے اشعار میں اور باتیں بھی ملتی ہیں۔ سودا نے بھی شاعری کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا۔

سودا کی فصاحت ہے جو کچھ نظم بیاں میں　　رکھتی وہ فصاحت نہیں خاقانی کی تقریر
وہ ربط سخن اور وہ آئین بیاں کا　　پاوے نہ کبھو کوئی کرے کیسی ہی تدبیر
خوبی معانی کہوں یا بندشِ الفاظ　　پاکیزہ بیانی کہوں یا صافی تقریر

ونیز مصحفی، ناسخ، انشا، انیس، غالب، میر حسن، اقبال وغیرہ کے ہاں شاعری کے بارے میں بہت کچھ اظہار خیال ہے بس انیس کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

یوں جلوہ گر ہیں شاہد معنی حجاب میں　　جس طرح حُسن چہرۂ یوسف نقاب میں
ہر سمت گل رخانِ مضامیں کا ہے ہجوم　　ہوتے ہیں سب ادا جو فصاحت کے ہیں رسوم

4.4.2 مشاعرے

مشاعرے اُردو تہذیب کا جزوِ لاینفک ہیں۔ فی زمانہ نشر و اشاعت کی اتنی سہولتوں، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے باعث حاصل ہونے والی آسانیوں اور اخبارات وغیرہ کی گرم بازاری کے باوجود مشاعروں کی اہمیت ہے۔ ان کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب یہ سارے وسائل نہیں تھے۔ الکٹرانک میڈیا تو کجا پرنٹ میڈیا بھی ایسی آسانی سے دسترس میں نہیں تھا۔ لوگ باگ کہیں جمع ہوتے، درباروں، امرا اور روسا کے ایوانوں اور معززین کے دیوان خانوں میں محفلیں جمتیں، شعرا اپنا کلام سناتے اور اوروں سے سنتے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں برقی کی سہولتیں کہاں؟ چنانچہ آج شمع روشن کرنا، روایت کے ایک حصہ کے طور پر ہے اس وقت ضرورت تھی۔ پھر شاعر، شمع کی روشنی میں اپنا کلام سناتا۔ ادبی گروہ بندیاں اور شاعروں کی ٹولیاں کچھ آج کی بات نہیں ابتدا ہی سے شاعروں کی اپنی اپنی ٹولیاں رہی ہیں۔ وجہی اور غواصی کی چشمک دکنی ادب کی تاریخ کا ایک حصہ ہے تو انیس اور دبیر، غالب اور ذوق اور انشا و مصحفی کی ادبی چشمکوں سے کون واقف نہیں۔ بحر اور وزن میں فرق تلفظ میں سہو یا لہجہ و اسلوب میں بے ترتیبی محسوس ہوتی تو مشاعروں میں کسی شاعر کے خلاف دوسرے گروہ کا محاذ بن جاتا اس کی سہو یا غلطی جو بھی کہیے، اس کو لے اُڑتے۔ مشاعرے کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں شاعر سے سامع کا راست رشتہ ہوتا ہے۔ سامعین بھی جوش وخروش سے مشاعروں میں حصہ لیتے اور شاعر کے کلام پر بے اختیارانہ اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے۔ شعر اچھا ہوتا تو داد دی جاتی اور اچھا نہ ہوتا اور اس میں سقم پایا جاتا تو آج کی اصطلاح میں ''ہوٹنگ'' کی جاتی۔ شاعر کو بھی اس کا احساس ہوتا، کبھی مجبوراً وہ اپنی خامی دور کر لیتا، کبھی مجبوراً قبول کرنا پڑتا۔ وہ جو شاعروں کی ٹولیاں ہوتیں وہ مخالف گروہ کے شاعر کی خامی کو اچھال کر کبھی کبھی تو رائی کا پہاڑ بنا دیتیں بلکہ شہر کی محفلوں اور مشاعروں میں ایسی باتیں تادیر موضوعِ بحث رہتیں...... تنقیدی زاویہ سے اس صورتِ حال کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عام آدمیوں کے ہوں یا مخالف ٹولی کے اعتراضات، ایک نوع کی تنقید ہی ہوتے۔ خواہ یہ اعتراضات زبان و بیان، عروض، ردیف وقافیہ، الفاظ کی نشست و برخاست، مصرعوں کے دروبست اور تلفظ ولہجہ کے باب میں ہوں، ان سے سامعین اور شاعروں کی ٹولی کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا۔ ٹھیک ہے بعض اوقات یہ اعتراضات برائے اعتراضات ہوتے اور دوسری ٹولی کو محض زک پہنچانے کی سعی ہوتی لیکن ان میں بسا اوقات دم خم بھی ہوتا اور یہ رویہ ضروری اس لیے بھی ہوتا کہ اس دور میں تنقید کی جو بھی صورتیں تھیں ان میں اس صورت کو امتیاز حاصل تھا۔ مشاعروں کو اس لیے بھی تہذیبی قدر کی حیثیت حاصل تھی بلکہ ہے بھی کہ بیشتر اوقات یہ اعتراضات، ادبی اور فنی زاویوں سے اپنا اعتبار رکھتے تھے۔ اس لیے شعرا کی بالعموم یہ سعی ہوتی کہ زبان و بیان پر زیادہ سے زیادہ قدرت حاصل ہو اور فن شعر کے اسرار و رموز سے کما حقہ واقفیت حاصل کی جائے۔ جہاں تک مبتدی اور نو آموز شعرا کا تعلق رہتا ان کو اول تو مشاعرے کی روایت کے مطابق پہلے ہی پڑھا دیا جاتا یہاں بھی یہ پہلو خاطر نشان رہے کہ نو آموز شعرا کے کلام میں خامی ہوتی تو یوں دور ہو جاتی۔

مشاعروں کا یہ بھی ایک افادی پہلو تھا کہ شعروادب کی نزاکتوں پر نظر جاتی اور اعلیٰ ادبی ذوق کی تربیت ہو جاتی۔ نوآموز شاعر اگر اچھا کہتے تو ان کی داد بھی دی جاتی اور تحسین وستائش کی جاتی۔ یہ بھی تنقید ہوتی کہ شاعر اپنی صلاحیتوں کو اور نکھارتا اور اجاگر کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ان کی ہمت افزائی ہوتی۔ اس خصوص میں ایک اور بات یہ کہ اگر کوئی کسی شاعر کی غلطی کی نشان دہی کرتا' عام غلطی ہوتی تو چل جاتی لیکن غلطی اگر عام نہ ہوتی تو ثابت کرنے کے لیے اساتذہ کے اشعار پیش کرنے پڑتے کہ فلاں شاعر نے یہ کہا ہے اور فلاں نے یوں۔ اس طرح اعتراضات کرنے والوں کو اساتذہ کے اشعار نوکِ زباں پر رکھنے پڑتے ورنہ ان کے اعتراضات کا نوٹس نہ لیا جاتا۔ طرحی مشاعرے ہوں تو ان کی نوعیت قدرے بدل جاتی طرحی غزلوں سے اندازہ ہوتا کہ شاعر کتنا قادرالکلام ہے۔ اس میں شعری صلاحیتیں کتنی ہیں اور وہ فن کی ظاہری ومعنوی نزاکتوں سے کس حد تک کام لے سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ مشاعرے جہاں دلچسپی کا ذریعہ تھے' ان سے ادبی ذوق کی تسکین ہوتی تھی تو وہ تنقیدی طور پر بھی اپنی اہمیت رکھتے تھے۔ اُردو تنقید کا یہ بھی ایک قابلِ لحاظ مرحلہ تھا۔ اس میں اتنی ترتیب وضابطگی نہ ہو مگر مشاعرے کی اس تنقید نے اُردو میں تنقید کی راہوں کو ہموار اور روشن کرنے میں اپنا جتنا بھی ہو' حصہ ادا کیا ہے۔

4.4.3 اساتذہ کی اصلاحیں

فی زمانہ شاعری میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ بھی ہے لیکن بے حد کم۔ اب تو یہ روایت مدھم اور دھندلی ہوتی جا رہی ہے۔ اب جو شاعری کا معیار گرنے کی عام شکایت ہے یا یہ کہنا کہ آج کے شاعر فنِ عروض سے بہت کم واقف ہوتے ہیں بلکہ نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ استادی اور شاگردی کے سلسلہ کا ختم ہونا بھی ہے۔ ورنہ پہلے تو استاد اور شاگرد کے رشتہ کی بڑی اور بنیادی اہمیت تھی۔ حتیٰ کہ غالب نے فارسی میں اپنے استاد کے طور پر ایرانی نژاد عبدالصمد کا نام گھڑ لیا کہ لوگ انہیں بے استادہ نہ کہیں۔ استاد ایسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ شاگرد نے اپنا کلام دکھا دیا' انہوں نے دیکھا اور اصلاح کردی۔ جی نہیں' ایسا وقتی اور سرسری معاملہ نہیں تھا۔ استادی اور شاگردی کا سلسلہ تو معاشرہ کی ایک بہت بڑی قدر رتھا اس کی امتیازی اہمیت تھی۔ امیر مینائی' داغ اور سیماب وغیرہ کے تو اپنے دفاتر تھے' حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔ رجسٹر ہوتے تھے جن میں شاگردوں کے نام' پتے اور دیگر تفصیلات درج ہوتی تھیں۔ استاد یہ خدمت بلا معاوضہ ادا نہیں کرتے تھے۔ استاد کی خدمت میں باضابطہ نذرانے پیش کیے جاتے تھے۔ احسن مارہروی نے تو داغ کی اصلاحوں اور ان کے شاگردوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ امیر مینائی کا بھی یہی حال تھا۔ سیماب اکبرآبادی کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اچھی خاصی ملازمت کو یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ وہ ملازمت کی ذہنی غلامی کو برداشت نہیں کر سکے تھے چنانچہ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر آگرہ میں 1922ء میں ''قصرالادب'' نامی ادارہ قائم کیا جہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ شاعروں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ بعدازاں شفا گوالیاری' ابراحسنی گنوری اور شارق جمال جیسے لوگ ملتے ہیں۔ ابراحسنی گنوری نے تو شاگردوں کے کلام پر اپنی اصلاحوں کو ''میری اصلاحیں'' کے بعنوان ایک سے زاید جلدوں میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ ایسے اساتذہ سخن میں جن کی اصلاحیں کتابی صورت میں یا جرائد وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عہد کا شعری رنگ ڈھنگ کیسا تھا۔ کیسے کیسے شاعر اساتذہ سے اصلاح لیتے تھے۔ اور تو اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اقبال نے داغ سے اصلاح لی تھی۔ ان اصلاحات سے اساتذہ کی غیر معمولی علمیت' فنِ شاعری پر ان کی بلا کی قدرت' اور زبان وبیان پر انتہائی دسترس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیزیں ان کے نکھرے ہوئے تنقیدی شعور کی غمازی کرتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ آج کے شعری منظرنامہ کی روشنی میں ہم ان اصلاحوں اور استادوں اور شاگردوں کے مراسم کو جانچیں' لیکن اس دور کے حالات' تہذیبی' علمی اور ادبی اقدار کو ملحوظ رکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ رسائل اور جرائد اور کتابوں کی اشاعت کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث اور کوئی صورت نہ تھی کہ یوں استفادہ کیا جاتا۔ مختصر یہ کہ استادی اور شاگردی کا سلسلہ اس دور کا ایک اہم ادارہ تھا' مشرقی تنقید کی ایک اہم روایت!

4.4.4 تذکرے

تذکرہ نہ تو سوانح ہے اور نہ تاریخ' نہ مرقع نگاری نہ تنقید۔ لیکن تذکرہ میں کم وبیش یہ سارے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ سوانح' تاریخ' مرقع اور تنقید وغیرہ کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں تو آپ کو تذکرہ ہی سے مدد لینی پڑے گی۔ آج بھی ہمارے ادبی معاشرہ میں تذکرہ کی اپنی اہمیت ہے۔ تذکرہ کوئی باضابطہ کتاب نہیں ہوتی۔ اس میں بہت کم کسی ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تذکرہ یوں کہیے' آپ کی ادبی ڈائری ہے۔ ایک نوٹ بک......آپ

کو کسی شاعر کا کلام پسند آیا۔ اس نوٹ بک میں لکھ لیا۔ کبھی اس شاعر کے بارے میں آپ کو معلومات حاصل ہوئیں، اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخ یا اور کوئی معلومات، آپ نے انہیں بھی درج کرلیا۔ شاعری کے بارے میں آپ نے اپنی رائے بھی لکھ دی۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں بھی۔ یہ تو عام لوگوں کی حد تک۔ بعض لوگ جو خود شاعر یا نثر نگار ہوتے ہیں، ظاہر ہے ان کا ذوق عام افراد کے مقابلہ میں کچھ اونچا ہی ہوگا اور وہ یہ کام کچھ زیادہ ڈھنگ ہی سے کریں گے۔ مثلاً شاعروں کے حالاتِ زندگی، ان کی سیرت، ان کے کردار، ان کے مزاج اور ان کے پڑھنے کا انداز...... ان پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ اور شاعروں کے کلام پر اظہارِ خیال بھی کریں گے۔ یہ اظہارِ خیال کسی ترتیب سے ضروری نہیں اور نہ کسی خاص تناسب سے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی شاعر کے بارے میں بہت زیادہ لکھ دیں۔ کسی کے بارے میں چند ایک سطریں، چند الفاظ۔ ضروری نہیں کہ ہر ایک کا سنہ پیدائش وغیرہ آپ لکھیں۔ کسی کی تاریخ آپ کو معلوم ہوسکتی ہے اور کسی کی نہیں بھی۔ اسی طرح آپ کو کسی شاعر کی دو چار غزلیں بھی مل سکتی ہیں اور کسی کے دو، تین اشعار۔ اسی طرح شاعر کے وطن وغیرہ کے بارے میں بھی آپ معلومات حاصل کرسکیں تو ٹھیک، ورنہ نہیں۔ غرض اس بے ترتیبی کے باوجود آپ بہت سا مواد جمع کرلیتے ہیں اور چونکہ باذوق ہیں اور شعر و ادب اور تنقید کا شستہ مذاق رکھتے ہیں تو آپ ان شاعرون کے حال احوال کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیں گے...... بس یہی تذکرہ سمجھیے۔

تذکروں کی ہماری ادبی تاریخ میں بغایت اہمیت ہے۔ ہمیں اُردو کے کئی ایک شاعروں کے بارے میں ابتدائی معلومات اور ان کے کلام کے نمونے انہی تذکروں سے حاصل ہوئے ہیں۔ بعد میں مزید تحقیق سے ان معلومات میں اضافہ کیا گیا۔ خود ان تذکروں کی تدوین کی گئی بلکہ ان تذکروں کی بنیاد پر ان شاعروں کے کلام وغیرہ کے حصول کی جدوجہد جاری رہی اور آج جو ہمارے شعری سرمایہ اور شاعروں کے بارے میں معلومات ہیں وہ بڑی حد تک انہی تذکروں کی مرہونِ منت ہیں۔ شاعروں کے بارے ہی میں نہیں شاعروں کے عہد اور ادوار کے بارے میں بھی معلومات کا خزانہ ہاتھ آیا ہے۔ مثلاً ان کے ادوار میں زبان اور شعر و ادب کی صورتِ حال کے بارے میں یہی تذکرے ہمارے لیے دروازے کھولتے ہیں۔ اُردو کے ابتدائی تذکروں میں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ ''گلشنِ گفتار'' اور افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی کا تذکرہ ''تحفۃ الشعرا'' ہیں۔ اور پھر انہی کے ساتھ میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ہے۔ آگے مزید کچھ کہنے سے قبل اس کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر چند کہ یہ تذکرے اُردو شاعروں کے باب میں ہیں لیکن تحریر کیے گئے فارسی میں۔ جس کی وجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ ان دنوں اُردو نثر کا رواج نہیں تھا۔ فارسی ہی علمی، ادبی اور تہذیبی زبان تھی۔ میر کے تذکرہ کے بعد ہمارے ہاں تذکرہ نویسی کا ایک سلسلہ ہے کہ ملنے لگتا ہے۔ اس خصوص میں میر حسن دہلوی کا ''تذکرہ شعرائے اُردو'' ہے جس کی اپنی امتیازی حیثیت کہی جاسکتی ہے کہ میر حسن نے اول تو یہ کہ ہر شاعر کے بارے میں جچی تلی رائے دی ہے، اُردو شعرا سے موازنہ بھی کیا ہے اور شاعر کے کلام کی خصوصیات پر ایک طرح سیر حاصل پیرایہ میں قلم اٹھایا ہے۔ ''تذکرہ شعرائے اُردو'' کے بعد ملنے والے تذکروں میں غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرے ''عقدِ ثریا''، ''تذکرہ ہندی'' اور ''ریاض الفصحا'' ہیں۔ مصحفی نے اعتدال سے کام لیتے ہوئے اپنے عہد کے ممتاز شاعروں اور اپنے عہد کی ادبی تحریکات کے بارے میں معروضیت کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر مصطفٰے خان شیفتہ کا تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' ہے۔ بعد ازاں قدرت اللہ قاسم نے تذکرہ ''مجموعۂ نغز'' پیش کیا۔ مرزا علی لطف کے تذکرہ ''گلشنِ ہند'' سے بھی اس دور کے ادبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ قیام الدین قائم چاند پوری نے ''مخزنِ نکات'' لکھا اور امام بخش صہبائی نے ''انتخاب دواوین''...... لوگ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کو بھی تذکرہ قرار دیتے ہیں لیکن اس میں تنقیدی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اس لیے اس کو تذکرہ اور تنقید کے درمیان کی کوئی چیز سمجھیے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے تذکرہ، تذکرہ ہے، اس کا تنقیدی کتاب کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا جانا چاہئے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تذکروں میں تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں اور اُردو تنقید کے ابتدائی خدوخال دیکھنے ہوں تو انہیں تذکروں کی سمت رجوع ہونا پڑے گا۔ تنقید کے موجودہ موقف کی روشنی میں یہ ایک اہم ابتدائی مرحلہ ہے۔ اُردو تنقید کے ارتقا میں اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

4.4.5 تقریظ

تقریظ نویسی جس کو مشرقی تنقید کا ایک پیرایہ کہنا چاہئے، آج کم کم سہی لیکن اُردو میں اس کا رواج زمانہ قدیم سے ہے۔ تقریظ کے معنی دراصل مدح یا تعریف کے ہیں اور مراد ایسی عبارت کے ہیں جس میں صاحبِ کتاب کی مدح یا تعریف کی گئی ہو۔ اس کو تنقیص (نقص نکالنا، برائی یا مذمت کرنا) کے متضاد مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ تنقید وہ ہے جس میں کتاب کی اچھائی یا برائی دونوں بیان کی گئی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ عربی میں لفظ ''تقریظ'' زیادہ تر تنقید ہی کے

معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اب بھی یہ اسی طرح مستعمل ہے لیکن جس طرح عربی کے بعض الفاظ اور تراکیب وغیرہ ہمارے ہاں اُردو میں کچھ اور مفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں یہی حال لفظ ''تقریظ'' کا ہوا۔ اُردو میں تو یہ لفظ صرف ایسی تحریر کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں کسی کی محض تعریف کی گئی ہو اور کتاب کے صرف محاسن بیان کیے گئے ہوں۔ اس لیے تقریظ کو تنقید کے مفہوم میں استعمال کرنے میں تکلف ہوتا ہے۔ ہاں' بعض بعض جگہوں پر تقریظ میں صرف مدح وستائش سے گریز بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کی مرتبہ ابوالفضل کی ''آئین اکبری'' پر غالب کی تقریظ کا حوالہ ضروری ہے۔ سرسید نے ''آئین اکبری'' مدون کی اور غالب سے خواہش کی کہ وہ اس پر تقریظ لکھیں۔ غالب نے تقریظ لکھی لیکن ''آئین اکبری'' اور سرسید کی تدوین کی کوشش کی ستائش کرنے کے برعکس سرسید اور زمانے کو متوجہ کیا کہ اب دنیا میں کیا کچھ ترقیات اور ایجادات نہیں ہو رہی ہیں' ان کی سمت توجہ دی جائے۔ اس ''تقریظ'' کو سرسید نے پسند نہیں کیا اور ''آئین اکبری'' میں شامل کرنے سے رہے۔ یہ تقریظ اپنی جگہ آج بھی موجود ہے۔ اس سے غالب ہی کے نہیں سرسید کے مزاج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ غالب نے اور تقریظیں بھی لکھی ہیں جن میں ان کے عزیز شاگرد نیلور کے متوطن' حبیب اللہ ذکا کی کتاب ''خاش وقماش'' پر تقریظ کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہاں غالب نے کتاب کے محاسن ہی کی ستائش کی ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کی مثنوی پر بھی تقریظ لکھی۔ تقریظ میں تحسین وستائش کے پہلو کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جانا چاہئے کہ لکھنے والے کے تنقیدی شعور کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ یہ تنقیدی شعور تعریف وستائش کے لیے استعمال کیا جارہا ہو یہ اور بات ہے۔ خود غالب نے ان کے علاوہ اور تقریظیں لکھیں۔ ان کے علاوہ بھی اُردو میں اور تقریظیں ملتی ہیں لیکن اب تقریظیں لکھنے کا رواج کم ہوگیا ہے۔ تنقید اپنی جگہ ہے اور اب کتابوں کے ابتدائی صفحات پر پیش لفظ یا پیش گفتار وغیرہ لکھے جاتے ہیں جن میں بعض یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر رسمی نوعیت کے ہوتے ہیں اور مروت میں لکھے جاتے ہیں۔

4.4.6 خطوط

مشرقی تنقید کی جھلکیاں خطوط میں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ خطوط میں کسی موضوع' شاعر یا رجحان کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے لیکن کسی کے استفسار پر یا یونہی کسی شاعر کے کلام اور اس کی زبان وبیان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ہوسکتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بھی تنقید نہیں ہے یہ محض رائے اور پسند یا ناپسند کی بات ہوسکتی ہے۔ کبھی کسی شعر کی تفہیم' کسی ترکیب' علامت یا کسی صنعت وغیرہ کے خصوص میں اپنے تاثرات پیش کردیے جاتے ہیں۔ یہ ستائشی کلمات بھی ہوسکتے ہیں اور اس سے ہٹ کر بھی۔ تاہم ایک بات ضرور ہے کہ چونکہ مکتوب الیہ سامنے نہیں ہوتا اس لیے ہم جی کھول کر اپنی بات کرلیتے ہیں اور یہ بھی کہ مکتوب الیہ سے بے تکلفی اور حد سے زیادہ مراسم ہیں تو بات اور دو ٹوک اور تکلف برطرف والے انداز میں ہوسکتی ہے۔ یہاں پھر ہم غالب ہی کے حوالہ سے بات کریں گے۔ غالب کے مراسم اپنے دور کی تمام ممتاز ادبی شخصیات سے تھے اور پھر ان کے کئی ایک شاگرد۔ ان کے خطوط کی تعداد کا کوئی اندازہ لگایا نہیں جاسکتا۔ آج بھی غالب کے خطوط کہیں نہ کہیں دستیاب ہوجاتے ہیں۔ غالب نے اپنے شاگردوں اور احباب کے استفسارات پر شعروادب کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور معائب اور محاسن پر کھل کر لکھا ہے۔ غالب کے خطوط کئی اصحاب نے' کئی کئی جلدوں میں مرتب کیے ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب کا شعور کتنا تیز اور بلند تھا۔ غالب کے خطوط کے بعد تو ارباب فن کے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ چل نکلا۔ سرسید' حالی' شبلی' امیر مینائی' اقبال' رشید احمد صدیقی اور پھر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ خطوط بھرپور تنقید کے ذیل میں نہ آتے ہوں لیکن ان میں شعروادب اور شاعروں وغیرہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے ان سے بھی تنقیدی رویے سامنے آتے ہیں۔ اُردو تنقید کے ابتدائی مراحل میں ان کی اہمیت ہے اور اُردو تنقید کے ارتقا میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. مشاعروں سے تنقیدی رجحانات کا پتہ کس طرح چلتا ہے؟
2. اساتذہ کی اصلاحوں سے کیا اندازہ ہوتا ہے؟
3. تذکروں کی کیا اہمیت ہے' لکھیے؟

4. غالب نے کن کن کی کتابوں پر تقریظ لکھی؟

4.5 تنقید نگار

اُردو تنقید پر آگے چل کر، افزوں ہوتے ہوئے مغربی ادب اور تنقید کے اثرات کے باوجود مشرقی تنقید اور شعریات کا اثر غالب رہا ہے۔ ابتدا یہ بہت زیادہ تھا لیکن بعدازاں کمیت کے اعتبار سے نہ سہی کیفیت کے اعتبار سے اس میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ابھی انگریزوں اور انگریزی تہذیب نے اپنے پاؤں نہیں پھیلائے تھے، مغرب کی سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات سے ابھی ہمارا معاشرہ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ فارسی سرکاری زبان ہی نہیں تھی ہماری علمی، ادبی اور تہذیبی زبان بھی تھی۔ زندگی اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس نے فارسی زبان، ادب اور تہذیب سے خوشہ چینی نہیں کی ہو۔ اس طرح مشرقی افکار اور اقدار ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے تھے۔ آزاد، حالی اور شبلی کے ہاں مغرب کی بو باس تھوڑی بہت ملتی ہے لیکن ان کے یہاں بنیادی طور پر اور من حیث المجموع فارسی اور مشرقیت کا عنصر حاوی تھا۔ ادب اور تنقید بھی ان سے کہاں دور ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے نقادوں کے ہاں منظر میں ہو کہ پس منظر میں مشرقیت کے خدوخال موجود ہیں۔

4.5.1 محمد حسین آزاد

سرسید کے رفقا میں جنھوں نے سماجی پس منظر میں مطالعہ کرتے ہوئے شعر و ادب کی قدر و قیمت کو محسوس کیا ان میں محمد حسین آزاد کا نام بھی ہے۔ محمد حسین آزاد 1829ء میں دہلی میں مولوی محمدؐ باقر کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ وہی محمد باقر ہیں جنہوں نے اُردو کا پہلا اخبار 'اُردو اخبار' شائع کیا۔ آزاد نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور شاعری میں استاد ذوق کے شاگرد ہوئے۔ بعدازاں انہوں نے دہلی کالج میں داخلہ لیا جہاں ذکاء اللہ، نذیر احمد اور پیارے لال آشوب جیسی شخصیتیں بھی طالب علم تھیں۔ آزاد نے اس ماحول سے فائدہ اٹھایا اور طالب علم کے دور ہی سے شعر گوئی اور مضمون نویسی کا آغاز کیا۔ انہوں نے 1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں کافی پریشانیوں کا سامنا کیا۔ ان کے والد کو انگریزوں نے شہید کر دیا۔ بعدازاں جب انتشار اور ابتری میں کمی ہوئی تو آزاد نے محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی۔ آزاد نے کابل، بخارا اور ایران کا سفر کیا جہاں انہیں جدید فارسی کے مطالعہ کا موقع ملا۔ بعض انگریزوں کے ساتھ مل کر انہوں نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی جہاں نئے طرز کی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ انہیں اُردو میں نیچرل شاعری کا بنیاد گزار قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی ذاتی پریشانیاں ایسی تھیں کہ وہ دیوانگی کا شکار ہو گئے۔ اس حالت میں بھی انہوں نے لکھا۔ اس وقت کے ان کے مضامین میں فلسفہ، ادب اور مذہب کی آمیزش ملتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی کئی تصانیف ہیں جن میں ''آبِ حیات'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے اس کو تذکرہ اور تنقید کے درمیان کی کڑی قرار دیا جاتا ہے۔ آزاد نے (77) سال کی عمر میں 22 رجنوری 1910ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

محمد حسین آزاد مشرقی مزاج کے حامل تھے ان کی تنقید پر بھی یہی رنگ چھایا ملتا ہے۔ آزاد کو انشاپردازی کی حیثیت سے بھی امتیاز حاصل ہے ان کی تنقید بھی اسی انشاپردازی کے زیر اثر ہے۔ ''آبِ حیات'' کو بھی مشرقی لطافتوں اور نزاکتوں کا آئینہ کہا گیا ہے۔ ان کے مشرقی مزاج کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ وہ کلام موزوں و مقفّی کے موثر ہونے کو بامعنی ہونے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کسبی چیز نہیں وہبی چیز ہے۔ چنانچہ انہوں نے شعر کو روح القدس اور فیضانِ رحمت الٰہی کہا ہے گویا وہ شاعری کو مابعد الطبعیاتی چیز متصور کرتے ہیں اور مشرقی تنقیدی نقطہ نظر کے مطابق شاعری کا رشتہ اخلاقیات سے جوڑتے ہیں اور صالح اقدار اور اخلاقی اعتبار پر زور دیتے ہیں۔ آزاد اپنی تنقیدات میں عموماً اندازِ بیان، صفائی کلام، برجستگی، فصاحت، بلاغت اسلوب اور لفظی محاسن پر نظر رکھتے ہیں اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے معنی و مفہوم کے اسرار ہی کو شاعری سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک شاعری ایک صنعت ہے۔ مولانا آزاد تنقید میں اس مسلک کے حامل تھے کہ نقاد ذوقِ حُسن کو اپنا رہنما بنائے۔ اور اس کے خیالات حسن اخلاق اور آداب سے دور نہ ہوں۔ محمد حسین آزاد نے تنقید میں ایک شخصی رنگ پیدا کیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی مشرقیت ہے۔ وہ تنقید میں تجزیے کو پسند نہیں کرتے بلکہ تمثیلی اور تاثراتی زاویہ نظر سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی فن پارہ کا کسی اور طرح جائزہ نہیں لیتے بلکہ اپنے ذاتی ذوق کو رہنما بنا کر رائے دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک تنقید، پسند اور ناپسند کا نام ہے۔ وہ غالب پر ذوق کو ترجیح دیتے ہیں۔ ذوق ان کے نزدیک ایک مثالی شاعر ہیں۔ آزاد کے نزدیک تنقید ایک ضابطہ اخلاق کی حیثیت رکھتی

ہے۔ وہ تنقید میں نہایت رواروی سے کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ کھل کر تنقید کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزاد نے اُردو شعروادب میں پہلی بار ماحول، شخصیت اور تخلیق کے رشتے کی اہمیت کا احساس دلایا یہی اُردو شعروادب اور تنقید کو ان کی دین ہے۔

4.5.2 حالی

خواجہ الطاف حسین حالی 1837ء میں پانی پت کے خواجگان انصاری کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہوئی۔ بھائیوں نے پرورش کی۔ وہ ابھی اور تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے کہ ان کی شادی کردی گئی۔ طلب علم ایسی تھی وہ کسی کو بتائے بغیر دہلی آ گئے۔ عزیزوں نے انہیں پھر پانی پت بلایا۔ انہی دنوں 1857ء کی پہلی جنگ آزادی ہوئی۔ حالی کے لیے یہ زمانہ مشکلوں کا تھا۔ 1857ء کے بعد وہ پھر دہلی آئے اور نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے لڑکے کے اتالیق مقرر ہوئے۔ وہ غالب سے بھی قریب ہوگئے۔ 1869ء میں غالب اور شیفتہ کی وفات کے بعد وہ لاہور آئے اور پنجاب بک ڈپو میں چھوٹی سی ملازمت کرلی۔ وہ یہاں اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی زبان درست کرنے پر مامور تھے۔ اسی دوران انہیں جتنی بھی ہو انگریزی سے واقفیت ہوئی، لاہور میں صحت خراب رہنے لگی۔ دہلی کالج میں پروفیسری کی خدمت پر مامور ہوئے اور جب انہیں حکومتِ حیدرآباد سے وظیفہ ملنے لگا تو انہوں نے ملازمت ترک کردی اور سارا وقت تصنیف و تالیف کے لیے وقف کردیا۔ انہیں 1904ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ 1914ء میں انہوں نے وفات پائی۔

حالی کی کئی تصانیف ہیں لیکن ''مقدمہ شعروشاعری'' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب کو نہیں ملی۔ حالی بھی شاعری کو عطیہ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ وہ شاعری کے ملکہ کو بیکار قرار نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک شاعری سے معاشرہ کی صلاح وفلاح کے کام لیے جاسکتے ہیں۔ سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود حالی نے اپنے طور پر ادب اور زندگی کو دیکھا۔ انہوں نے سیدھی سادی باتوں میں زندگی کے وہ مسائل پیش کیے جو ان کے عہد سے مطابقت رکھتے تھے۔ انہیں اپنے عہد کے معاشرے کے زوال کا احساس تھا لیکن وہ اس زوال سے نکلنے کے لیے ماضی کے اعلیٰ کارناموں اور تہذیبی قدروں کی بازیافت پر زور دیتے ہیں۔ یہ مغرب اور مشرق کی آمیزش کا صالح تصور تھا جو حالی کے یہاں ملتا ہے۔ ان کی زندگی میں جو سادگی، سچائی، راستی اور انسان دوستی پائی جاتی ہے وہی ان کے ادب اور تنقید میں بھی ہے۔ مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی تنقید مشرقی اقدار وآداب کی حامل ہے۔ وہ اصلاحی اور اخلاقی زاویوں سے شعروادب کی جانچ پر زور دیتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ حالی، ادب اور اخلاق کے رشتہ پر زور دینے والوں کے پیشرو ہیں۔ تنقید کا یہ مشرقی رویہ ان کی تحریروں میں جہاں تہاں واضح ہے۔ حالی نے اپنے تنقیدی افکار کی بنیاد ہر چند کہ فارسی کے شعری نظریات پر رکھی لیکن مشرقیت سے ان کی وابستگی کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کہیں مغرب کے کسی تنقیدی رویہ کو اہمیت دیتے بھی ہیں تو اس کو کسی نہ کسی طرح مشرق کے تصورِ شعر سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' میں حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی اصل اور بنیاد دراصل مشرقیت ہی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں وہ مغربی تصورات کا ذکر کرتے ہیں تو فوراً ہی عربی کی تنقیدی کتابوں سے اس کی تائید بھی چاہتے ہیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' کی حالی کی تصانیف ہی میں اہمیت نہیں بلکہ اُردو شاعری اور تنقید میں بھی اس کی اہمیت ہے۔ حالی نے شعر کے لیے جوش، اصلیت اور سادگی کی بات کی ہو یا شاعر کے لیے انہوں نے تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کی شرائط عائد کی ہوں۔ بنیادی طور پر ان کا رشتہ مشرقی شعریات سے ہے اور حالی نے یہ رشتہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ یوں ''مقدمہ شعروشاعری'' مشرقی شعریات کی اساس پر اُردو میں تنقید کی پہلی کتاب ہے۔

4.5.3 شبلی

مولانا شبلی نعمانی 1857ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انہیں عربی، فارسی، مذہب اور فلسفہ کی تعلیم اپنے وقت کے جید علما سے حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ شبلی اپنے والد کی طرح وکالت کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی طرف طبیعت راغب نہ ہوئی اور انہوں نے علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد کی ملازمت قبول کرلی۔ یہاں انہیں سرسید، حالی، محسن الملک اور پروفیسر آرنلڈ جیسی شخصیات کی صحبت حاصل ہوئی۔ علم وادب، معاشرت اور ثقافت کے نئے افق ان کے سامنے آئے۔ آرنلڈ کے ہمراہ انہوں نے مصر، شام اور دیگر اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور اپنی کتابوں کے لیے وہاں سے مواد جمع کیا۔ اگر چہ سرسید سے ان کے تعلقات میں کبھی کوئی منفی موڑ نہیں آیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسید سے ان کی نظریاتی طور پر پوری ہم آہنگی نہیں تھی۔ چنانچہ سرسید کے

انتقال کے بعد انہوں نے علی گڑھ سے استعفیٰ دے دیا اور اعظم گڑھ میں اسکول قائم کیا۔ حیدر آباد میں بھی جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں انہوں نے ملازمت کی۔ اپنے قیام حیدر آباد کے دوران انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ شبلی کے اپنے سیاسی نظریات تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت کی۔ وہ اپنے نظریات پر شدت سے قائم رہے۔ 1914ء میں شبلی کا انتقال ہوا۔

شبلی مشرقیت کے دلدادہ تھے۔ ان کے پاس تاثراتی تنقیدی رویہ ملتا ہے۔ وہ ادب کی اخلاقی اقدار پر زور دیتے ہیں۔ ان کی ادبی تنقید کی بنیادی بحثوں میں مشرقی معیار نقد کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے فکر و فن کا دائرہ عربی اور فارسی روایات کا احاطہ کرتا ہے۔ عربی اور فارسی کے ناقدین کے بعد انہوں نے اگر کسی کے حوالوں سے کام لیا ہے تو وہ ارسطو ہے' انہوں نے ارسطو کے خیالات سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ وہ شعر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس کو تخیل کا ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ ان کا زور محاکات پر ہوتا ہے۔ مصوری اُن کے نزدیک شعر کی اصل صفت ہے۔ شبلی' تاثراتی نقادوں کی طرح الفاظ کو معانی پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بلاغت اور نظامِ بلاغت کی اہمیت ہے۔ ''شعر العجم'' میں اصولی بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنے موقف کی خوبی کے ساتھ صراحت کی ہے۔ اسی طرح ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں انہوں نے جس پیمانے کو تمام پیمانوں پر افضلیت دی ہے وہ فصاحت اور بلاغت کا پیمانہ ہے۔ مختصر یہ کہ شبلی نے خواہ کسی کے بارے میں بحث کی ہو مشرقی معیارات ہی کا سہارا لیا ہے۔ اُن کے تنقیدی نظریات پر مشرقی شعریات اور اصولِ نقد کی چھاپ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایسا ہونا ضروری بھی تھا کہ وہ انگریزی سے کس قدر واقف ہوں یہ علحدہ بات ہے لیکن وہ اپنے ذہنی پس منظر اور مطالعہ کی روشنی میں مشرقی روایات سے ہی قریب ہو سکتے تھے۔ شبلی نے مشرقی معیار نقد ہی پر گفتگو کی ہے اور ان کی عملی تنقید بھی مشرقی معیارات کے آس پاس ہی رہتی ہے۔ چنانچہ میر انیس کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ فصاحت' بلاغت' روزمرہ' محاورہ' تشبیہہ استعارہ' منظر نگاری واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے حوالہ ہی سے گفتگو کرتے ہیں۔ غرض شبلی نے اپنے تنقیدی رویہ سے کام لیتے ہوئے اُردو تنقید کو بہت کچھ دیا اور مشرقی تنقیدی رویہ کو بھی استحکام بخشا۔

4.5.4 عبدالرحمٰن بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری 1885ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں ہوئی۔ یہاں سے انہوں نے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی اسناد حاصل کیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ قومی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ مخالف سامراج جذبات نہ صرف ان کے دل میں موجزن تھے بلکہ انہوں نے ایسے جذبات کے حامل طلبہ کے گروہ کی قیادت بھی کی۔ انہوں نے 1907ء میں ایم۔ اے۔ اوکالج میں ہونے والی تاریخی ہڑتال کی رہنمائی کی تھی۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب کہ بجنوری کے ذہن کی تشکیل ہو رہی تھی۔ قومی عظمت کا احساس ان کے قلب و نظر میں سماتا جا رہا تھا۔ یہ حالات تھے کہ 1910ء میں بجنوری کو یورپ جانے کا موقع ملا۔ انہوں نے لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے جرمن اور ترکی زبانوں پر مہارت پائی۔ کئی یورپی ممالک یونان' اٹلی' بلغاریہ' فرانس اور ترکی کی سیاحت بھی کی۔ انہوں نے مغرب میں رہ کر مغرب کو دیکھا' مغرب کی سطحیت' کھوکھلا پن اور وہاں کا استحصالی نظام ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ اور بجنوری کے ذہن پر اس کا لازمی ردِعمل یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی ذات' اپنے قومی ورثے اور اپنے شعر و ادب کی خوبیوں کو دیکھا۔ انہوں نے مغرب کو ہر پہلو سے دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ ہندوستان ایسا کوئی تہی دست اور تہی دامن نہیں کہ ہم احساس کمتری کا شکار ہوں۔ وطن واپس ہو کر بجنوری نے ایک مختصر سی مدت کے لیے وکالت بھی کی لیکن وہ وکیل بن سکے اور نہ سیاست داں اور نہ معاشرتی مصلح۔ انہیں تعلیمی امور سے دلچسپی رہی لیکن بنیادی طور پر وہ ادیب تھے اور ادیب رہے۔ بجنوری کو غالب سے پہلے ہی سے دلچسپی تھی۔ مولوی عبدالحق کی فرمائش پر انہوں نے مقالہ ''محاسنِ کلامِ غالب'' تحریر کیا۔ مشیت الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ 17/نومبر 1918ء کو صرف (33) سال کی عمر میں بجنوری کا انتقال ہوا۔ اس مقالہ کی اشاعت اُن کے انتقال کے کوئی (3) سال بعد عمل میں آئی۔

ڈاکٹر بجنوری اُن قلم کاروں میں ہیں جنہوں نے بہت کم لکھا لیکن جن کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ہر چند کہ بجنوری کے مضامین کا مجموعہ ''باقیاتِ بجنوری'' بھی ہے۔ لیکن ان کی وجہ شہرت ''محاسنِ کلامِ غالب'' ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی جریدہ ''اُردو'' کے پہلے شمارہ جنوری 1921ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اور اسی سال اس کو علحدہ کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ اس مقالہ کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجنوری کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ مغرب کی کئی زبانوں اور ممالک کے شعروادب، کئی ممالک کے موسیقاروں، ڈراما نگاروں اور نہ جانے کیا کیا کچھ کے بارے میں وہ معلومات کا خزانہ رکھتے تھے۔ وہ بجائے خود ایک انسائیکلو پیڈیا تھے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ مغرب اور مغرب کے شعروادب اور فنونِ لطیفہ سے آگہی کے باوجود بجنوری مغرب سے مرعوب ہونا تو کجا؟ اس سے متاثر بھی نہیں ہوئے۔ مشرقیت ان کے مزاج، ان کی پسند ناپسند، ان کے ذوق ان کی نظر اور اُن کے نظریوں کی اساس تھی۔ ان کی روح تھی۔ وہ مشرق کے دیوانہ وار پرستار تھے بلکہ مشرق کی پرستش کرتے تھے۔ غالب کے بارے میں انہوں نے جس زاویہ سے اور جس قدر لکھا اس زاویہ سے اور ایسا شاید ہی کوئی لکھ پائے۔ وہ غالب کے تعلق سے غلو کا شکار تھے۔ بجنوری کے مقالہ کو تاثراتی تنقید کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے اگر چہ بعض لوگ تو اس کو تنقید ہی نہیں مانتے۔ پروفیسر گیان چند جین تو اس کو قصیدہ خوانی، طبل نوازی اور وکالت قرار دیتے ہوئے علم کی بھدی نمائش سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''محاسنِ کلام غالب'' سے بجنوری کا غالب سے عشق نہیں، مشرقیت سے جنون ظاہر ہوتا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. محمد حسین آزاد کی زندگی کے بارے میں لکھیے۔
2. حالی کے ''مقدمہ شعروشاعری'' کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیجیے۔
3. تاثراتی نقاد کی حیثیت سے شبلی کے بارے میں لکھیے۔
4. عبدالرحمٰن بجنوری کے مقالہ پر اظہار خیال کیجیے۔

4.6 خلاصہ

تنقید کسی چیز کے جانچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کہتے ہیں۔ ادبی تنقید سے مراد علم اور کامل بصیرت کے ساتھ مناسب پیرایہ میں کسی ادبی فن پارہ کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرنے اور اس کے بارے میں حکم لگانے کا نام ہے۔ اور یہ فیصلہ دینا بھی ہے کہ کون سا رخ ادب اور زندگی کی ترقی اور صلاح وفلاح کے لیے سودمند اور کارآمد ہوتا ہے۔ اگر تنقید یہ کام نہیں کر سکتی تو اور کچھ نہیں کر سکتی۔ ہمارے ہاں بہت سے قلم کار ایسے ہیں جو تاثرات کو تنقید کا نام دیتے ہیں لیکن تاثرات کو تنقید قرار دینا کئی ایک کے نزدیک محل نظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو میں خاص طور پر ابتدا میں تاثرات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

تاثرات مشرقی شعریات اور مشرقی زاویہ تنقید میں جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات خاطر نشین رہے کہ مشرقی شعریات سے مراد عربی اور فارسی شعریات ہی نہیں ہیں بلکہ شمالی ہند کی زبانوں پراکرت، اپ بھرنش، پالی اور اودھی وغیرہ کی وساطت سے سنسکرت اور سنسکرت شعریات کا بھی اُردو پر خاصا اثر رہا ہے۔ بارہ ماسہ اور اقبال کے ہاں بھرتری ہری کے حوالے اُردو پر سنسکرت شعریات کے اثرات کا مدلل ثبوت ہیں۔ چنانچہ کہنا چاہیے کہ مشرقی شعریات وہ ہے جو سنسکرت عربی اور فارسی کے اُردو پر اثرات سے برگ وبار لائی۔ عمومی طور پر مشرقی تنقید سے مراد وہ تنقید ہے جو شاعری کی ہیئت، الفاظ کی چکاچوند اور فنی محاسن سے تعلق رکھتی ہے۔ سادہ اور بول چال کی زبان کی مشرقی تنقید میں اہمیت ہے۔ مشرقی تنقید میں کسی نقطہ نظر یا کسی دبستانِ تنقید کے تحت تجزیہ کا سوال ہی نہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخاست اور ان کے محلِ استعمال پر مشرقی تنقید زور دیتی ہے اور تشبیہہ، استعارے، اشارے، کنایے اور تلمیح وغیرہ کی روشنی میں فن پارہ کا جائزہ لیتی ہے۔ مشرقی تنقید سے فن پارہ کی صحیح قدر قیمت کا اندازہ نہ کیا جاتا ہو لیکن اس سے زبان اور اسلوب کے معیارات کا تعین کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نئے تنقیدی رجحانات، میلانات، افکار اور نظریات کے باوجود مشرقی تنقید فن، طرزِ ادا زبان وبیان اور اسلوب کے تعلق سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا ایک حد تک افادہ آج بھی ہے۔

اُردو میں تنقید کی روایت ابتدا سے رہی ہے۔ اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ اُردو کے قدیم اور کلاسیکی شاعروں کے یہاں ہجر و وصال اور رب

ورخسار کی باتیں ہی ملتی ہیں۔ ہر دور میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق تنقید کا اپنا دائرہ رہا ہے۔ اشعار، مشاعرے، تقریظ، اساتذہ کی اصلاح وغیرہ سے ان ادوار کے تنقیدی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ دکن میں وجہی نے قطب مشتری میں اچھے شعرا و شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ابن نشاطی نے بھی اس طرف توجہ دی۔ سودا، میر، ناسخ، انشا، غالب، میر حسن اور اقبال وغیرہ نے بھی اپنے اشعار میں شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مشاعرے تنقیدی مزاج کی جلوہ نمائی میں اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے کہیں کوئی فنی یا ادبی نقص پایا جائے تو ٹوک دینا اس کی اچھی مثال ہے۔ شاعری میں استادی شاگردی کا سلسلہ ان دنوں کم ہے لیکن کبھی یہ باتیں اہمیت رکھتی تھیں۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح سے اساتذہ کے تنقیدی مزاج اور رویہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں بیشتر شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اساتذہ کی حیثیت سے اپنے شاگردوں کی تربیت کی۔ ان کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح تذکروں کی بھی اہمیت ہے۔ تذکرہ نگاروں نے جس شاعر کے بارے میں جتنا مواد ملا لکھ رکھا، اُن کے اشعار بھی جیسے اور جتنے ملے اور ان کی زندگی کے بارے میں معلومات بھی۔ بعد ازاں ایسے تذکرے غنیمت ثابت ہوئے کہ ان کی بنیاد پر تحقیق ہوئی اور شاعروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات ملیں۔ تذکرہ نگاروں نے ان شاعروں کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تنقیدی ذہن کو بھی بڑھنے کا موقع دیا۔ اُردو میں ایسے کئی تذکرے ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ تقریظوں سے بھی لکھنے والوں کے تنقیدی مزاج کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ تقریظ میں عموماً تحسین وستائش ہوتی ہے۔ یہی سہی لیکن اس سے بھی تنقید کے ارتقا کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ غالب کی تقریظیں اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح خطوط بھی ہیں کہ شاعروں نے افہام وتفہیم کے سلسلہ میں یا استفسارات پر خطوط میں شعر وشاعری کے نکتوں کی صراحت کی...... اُردو میں مشرقی شعریات اور تاثراتی تنقید کے اظہارات آج بھی ملتے ہیں لیکن پہلے اس کا بازار گرم تھا۔ ہمارے ہاں ایسے کئی تنقید نگار ہیں جن کے نقطہ نظر سے آپ اتفاق نہ کریں لیکن جن کے قلم کی عظمت کو سب سلام کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد ان میں سے ایک ہیں۔ ''آبِ حیات'' ان کی مایہ ناز کتاب ہے۔ آزاد شاعری کو وہبی چیز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے شعر کو روح القدس اور فیضانِ رحمت الٰہی کہا ہے۔ وہ شاعری کا رشتہ اخلاقیات سے جوڑتے ہیں اور اندازِ بیان، صفائی کلام، برجستگی، فصاحت، بلاغت، اسلوب اور لفظی محاسن پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں تنقید پسند یا ناپسند ہے۔ وہ کسی تنقیدی نظریہ کو نہیں اپنے ذوق کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں۔ حالی بھی شاعری کو عطیہ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ حالی کی زندگی میں جو سادگی، سچائی، راستی اور انسان دوستی پائی جاتی ہے وہی ان کے ادب اور تنقید میں بھی ہے۔ حالی نے دو، تین مغربی حوالوں سے بھی کام لیا ہے لیکن ان کی اساس مشرقی شعریات ہے۔ اور ''مقدمہ شعر وشاعری'' مشرقی شعریات کی اساس پر اُردو میں تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ شبلی نے تاثراتی تنقید کی بنیادوں کو استوار کیا۔ وہ ادب کی اخلاقی قدروں پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک الفاظ، معانی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید فصاحت، بلاغت، روزمرہ محاورہ، تشبیہہ، استعارہ، منظر نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری سے مکالمہ رکھتی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے ابتدا ہی سے قومی عظمت کے احساس کو اپنے دل میں جگہ دی۔ انہوں نے جو زمانہ مغرب میں گزارا اس وقت انہوں نے مغرب کو قریب سے دیکھا۔ مغرب کے کھوکھلے پن، اس کی سطحیت اور وہاں کے استحصالی نظام کا انہوں نے تجزیہ کیا اور اس نتیجہ سے ہمکنار ہوئے کہ ہندوستان ایسا تہی دست اور تہی دامن نہیں کہ ہم احساس کمتری کا شکار ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تجربات، احساسات اور تاثرات کو ''محاسن کلام غالب'' کی صورت میں پیش کیا۔ وہ مغرب سے مرعوب ہوئے بغیر مشرق کے پرستار رہے۔ بجنوری کے ''محاسن کلام غالب'' کو تاثراتی تنقید کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ اگر چہ بعض لوگ ''محاسن کلام غالب'' کو تنقید ہی نہیں مانتے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ''محاسنِ کلام غالب'' سے بجنوری کا غالب سے عشق نہیں، مشرقیت سے جنون ظاہر ہوتا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. اُردو میں تنقید کی روایت کا سیر حاصل جائزہ لیجیے۔
2. تاثراتی تنقید نگاروں کے بارے میں مضمون لکھیے۔

